انتقالِ اقتدار اور بندر بانٹ

انتخابات کا شور وشغب ختم ہوا، بلی تھیلے سے باہر آئی اور انتقالِ اقتدار کے مرحلے پر بندر بانٹ کا کھیل شروع ہو گیا۔ حالیہ انتخابات میں دینی قوتوں کی نمائندہ مجلس عمل کی شاندار کامیابی نے سیکولر قوتوں کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ خود مجلس عمل کی قیادت کو بھی اتنی زیادہ کامیابی کی توقع نہیں تھی۔ فی الحقیقت عوام نے مظلوم طالبان کی کھلی حمایت اور امریکی سامراج کے وطنِ عزیز پر ناجائز تسلط و مداخلت کے خلاف مجلس عمل کے انتخابی منشور اور پروگرام کے حق میں جرأت مندانہ فیصلہ دیا ہے۔

اس وقت سیاسی اکھاڑے میں مسلم لیگ (ق)، پی پی پی اور متحدہ مجلس عمل لنگر لنگوٹ کس کر ''زور'' آزمائی میں مصروف ہیں۔ قومیت، لسانیت، صوبائیت اور فرقہ واریت کی آگ کو ہوا دینے والے چھوٹے چھوٹے گروہ اکھاڑے سے باہر بیٹھ کر تماشائے اہلِ سیاست دیکھتے ہیں۔ اگرچہ وہ خود بھی تماشا ہو گئے ہیں۔

مجلس عمل نے متفقہ طور پر مولانا فضل الرحمٰن کو وزیر اعظم کے عہدے کے لئے نامزد کیا ہے جبکہ مسلم لیگ ''ق'' نے مولانا کے مقابلے میں ظفر اللہ جمالی کو نامزد کیا ہے۔ پی پی پی کے امین فہیم اکھاڑے میں ضرور اترے ہیں مگر کشتی سے گریز پا ہیں۔ بابائے جمہوریت نواب زادہ نصر اللہ خان کا حقہ گرم ہے، انہوں نے اے آر ڈی، جس میں پی پی اور مسلم لیگ (ن) بھی شامل ہیں کی طرف سے مولانا فضل الرحمٰن کی حمایت کا اعلان کر دیا ہے۔ وزارتِ عظمٰی کے لئے اب صرف دو امیدوار آمنے سامنے ہیں۔ مولانا فضل الرحمٰن اور ظفر اللہ جمالی۔

مجلس عمل اور اے آر ڈی نے متفقہ طور پر لیگل فریم ورک آرڈر، پی سی او، اور اس کے تحت تمام آئینی ترمیمات کو مسترد کر دیا ہے۔ حتیٰ کہ باوردی صدر بھی قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ ادھر چیف الیکشن کمشنر نے ۸ نومبر کو قومی اسمبلی کا اجلاس طلب کر لیا ہے۔ تمام سیاسی جماعتیں حکومت مخالف کیمپ میں ہیں اور حکومتی کیمپ میں صرف مسلم لیگ (ق) بیٹھی ہے بلکہ ''مایوں بیٹھی'' ہے۔ دولھا کون بنتا ہے اور سہرا کس کے سر بندھتا ہے؟ مولانا فضل الرحمٰن یا جمالی؟ دونوں پھونک پھونک کر قدم رکھ رہے ہیں کبھی کبھی یہ قدم مخلوط حکومت کی طرف بھی بڑھتے محسوس ہوتے ہیں۔ اگرچہ مخلوط حکومت والی کمپنی چلتی نظر نہیں آتی۔ تاہم انتقالِ اقتدار کے حوالے سے حکومت کی طرف سے ''بندر بانٹ'' والی کہانی دہرائے جانے کے خدشات زیادہ واضح ہیں۔ مجلس عمل کے لئے غیر مستحکم پارلیمنٹ میں مجبور و مخلوط حکومت قبول کرنے کی بجائے مضبوط حزبِ اختلاف کا کردار ہی نفع بخش ہوگا۔ جنرل صاحب کو بھی مذہبی کی بجائے سیکولر وزیر اعظم ہی قبول ہوگا جو ان کی افغان کش اور امریکہ نواز پالیسیوں کو جاری رکھے اور آئینی ترمیمات کو نہ صرف باقی رکھے بلکہ تحفظ بھی فراہم کرے۔ مجلس عمل کو جو مینڈیٹ ملا ہے اسے بحال ہی نہیں بلکہ اس میں اضافے کے لئے انہیں اپنی وحدت کو برقرار رکھنا ہوگا۔ ان کا منشور اور نصب العین اقتدار سے زیادہ اہم ہے۔

دیکھیں، کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک